چراغ حویلی سے ابا جانی کا جنازہ کیا نکلا کہ پھول سے خوشبو نکل گئی۔ کیا امی جمی رہتی تھی۔ مطب مریضوں سے بھرا ہوا۔ دیوان خانے میں ملاقاتیوں کی چہک مہک۔ اب مطب سنسان تھا۔ دیوان خانہ ویران تھا۔ ڈیوڑھی سونی پڑی تھی۔

ہمارے ابا جانی طب کے آخری چشم و چراغ تھے۔ وہ دنیا سے سدھارے تو پھر خاندان کی مسند طب پر کوئی بیٹھنے والا نہ رہا۔ ابا جانی اس فن شریف کے رموز و نکات کو کسے منتقل کرتے سینہ پہ دھر کے لے گئے۔ ان کا ملال اس ناخلف کے دل پر داغ ہے۔ مگر کیا کرتا طبیعت سے مجبور تھا۔ ابا جانی نے سکھانے پڑھانے کی اپنی سی کوشش کی مگر طبیعت نے اس ہنر سے میل نہیں کھایا یا شاید تقدیر ہی میں فرنگی کی چاکری لکھی تھی۔ ابا جانی کا اثر و رسوخ کام آیا۔ نائب تحصیلداری کی اسامی پر تقرری ہو گئی۔ اس چاکری نے فقیر کو بہت خراب کیا۔ آج یہاں کل وہاں۔ روز روز کے تبادلوں نے کہیں جم کر بیٹھنے نہ دیا اور جس شہر میں تبادلہ ہوتا وہ شہر کاٹ کھانے کو آتا۔ ایک شہر بھلا لگا مگر وہاں اور ہی افتاد پڑی۔ الٰہی کسی کو مسافرت میں دل زدہ مت کیجیو۔ باقی شہروں میں سو طرح کے رنج کھینچے۔ مگر اس شہر میں آ کر رنج عشق کھینچنا پڑا کہ سب رنجوں سے سوا تھا۔ صاحبو وہ شہر ناپرساں نکلا۔ شربتِ وصل تو دور رہا اس عشوہ طراز نے تو ایک جھلک دکھا کر شربتِ دیدار کو بھی ترسا دیا۔ کتنے پاپڑ بیلنے اور خوار ہونے کے بعد ملاقات کی گھڑی آئی۔ مگر کیا آئی، وصل کے نام پر وہ خام پارہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ پھر تو ایسی گئی کہ پیچھل نہیں دکھائی۔ کتنے دنوں اس شہر میں خراب پھرتا پھرا۔ سدھ بدھ کھو بیٹھا۔ طبیعت خفقانی ہو گئی۔

انہیں دنوں ایسا ہوا کہ بڑے دن کی چھٹیوں میں گھر آنا پڑا۔ ابا جانی نے میری صورت دیکھی تو کھٹک گئے۔ آخر زمانے کا گرم و سرد دیکھے ہوئے تھے۔ پھر در پر اُن کے ایسے مریض بھی تو آتے تھے کہ انہیں کوئی بیماری نہیں ہوتی تھی۔ مگر وہی سب سے بڑھ

کر بیمار ہوتے تھے۔ ابا جانی نے اس بیمار کا علاج خوب سوچا کہ جھٹ پٹ تلاش کر کرا کے ایک نیک بخت کے ساتھ ہمیں رشتۂ مناکحت میں باندھ دیا۔ ساتھ ہی یہ بندوبست کیا کہ حکام بالا سے کہہ سن کر ہمارا تبادلہ دور کے شہر میں کرا دیا۔

علاج کارگر ہوا۔ ازدواجی ذمہ داریوں نے مجھے اُلجھا لیا۔ پھر آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ جب وہ شہر ہی چھٹ گیا تو اس شہرِ خوبی کا خیال بھی دور ہوتا چلا گیا۔ یوں اب بھی جب اس کا خیال آجاتا ہے تو دل تلملا جاتا ہے۔ خیر تو جب طوفان ذرا تھما تو اپنی سرکاری ذمہ داریوں کا بھی دھیان آیا۔ پھر میں نے دلجمعی سے اپنے فرائض منصبی بجالانے شروع کئے۔ پھر تو ترقی کے در وا ہو گئے اور درجات بلند حاصل ہوتے چلے گئے۔ آخر الامر ڈپٹی کلکٹری کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوا۔ اس منصب کو فقیر نے اس خوش اسلوبی سے نبھایا اور سرکار انگلیسیہ کی وہ خدمات انجام دیں کہ حکام بالا نے خوش ہو کر ریٹائرمنٹ کے وقت مجھے خان بہادری کا خطاب عطا فرمایا اور آنریری مجسٹریٹ کے منصب سے نوازا کہ ہنوز جاری ہے۔ آگے اس ڈیوڑھی پر مریضوں کا ہجوم رہتا تھا۔ اب داد خواہوں کا مجمع ہوتا ہے۔ مگر ڈیوڑھی کی وہ رونق اجداد کے کسبِ کمال سے تھی، یہ رونق فرنگی حکام کی نظرِ کرم کی مرہونِ منت ہے۔ سو اس کا کیا اعتبار، آج ہے کل رہے رہے نہ رہے۔ آسمان کا رنگ جوں جوں بدلتا ہے توں توں فقیر کا دل ہولتا ہے۔ چراغ حویلی دائم آباد رہے مگر میرے دل میں وسوسہ بیٹھ گیا ہے۔ تیور جو زمانے کے اچھے نہیں ہیں۔

۵

میں نے دیکھا کہ آشیانے کی منڈیریں سپاٹ ہیں، نہ کوئی برجی، نہ کوئی ٹٹی۔ میرا دل بیٹھ گیا اب سے پہلے یہ بات میرے دھیان ہی میں نہیں آئی تھی۔ نئے گھر کا بھی عجب نشہ ہوتا ہے نئی تعمیر ایسا سحر باندھتی ہے کہ تعمیر کی خامیاں اور کمیاں نظر ہی نہیں آتیں۔ وقت کے ساتھ بالعموم موسموں کے اثر سے یہ نشہ رفتہ رفتہ اترتا ہے اور سحر ٹوٹتا ہے پھر یہ خامیاں اور کمیاں نظر آنی شروع ہوتی ہیں مجھے تعمیر میں اس نقص کا احساس پرندوں کے واسطے سے ہوا میں نے دیکھا کہ پرندے آشیانے کی منڈیروں سے کنی کاٹ کر نکل جاتے ہیں اور قریب میں کھڑے ہوئے درختوں کی پھننگوں پر جا کر پڑاؤ کرتے ہیں۔ میرے لیے ان کا یہ طرز عمل تعجب خیز تھا اور مایوس کن بھی۔ مجھے کتنا اشتیاق تھا کہ رنگ برنگے پرندے ہمارے آشیانے کی منڈیروں پر آ کر ٹھکانا کریں چہچہائیں۔ توقع تو یہی تھی۔ منڈیروں میں پرندوں کے لیے ایک کشش ہوتی ہے پرندہ کتنے ہی لمبے سفر پر رواں دواں ہو مگر رستے میں کوئی منڈیر نظر آ جائے تو وہ اس پر ضرور اتر پڑتا ہے بیشک گھڑی بھر بعد پھر اڑ جائے۔

میں نے پرندوں کے اس طرز عمل کی توجیہہ پہلے تو یہ کی کہ آشیانہ ابھی نیا نیا ہے نئی دیواریں اور منڈیریں پرندوں کے لیے اجنبی اجنبی ہوتی ہیں شاید وہ انہیں اپنی کشادہ فضا میں رخنہ نظر آتی ہیں مگر موسموں کے عمل کے ساتھ ساتھ منڈیریں پرندوں کے لیے مانوس ہوتی چلی جاتی ہیں اور کسی کسی منڈیر سے تو ان کا انس اتنا بڑھ جاتا ہے کہ ہر پھر کر وہ اسی پر آ کر پڑاؤ کرتے ہیں اور کسی کسی پرندے کا رشتہ تو منڈیر کے ساتھ اتنا گہرا ہو جاتا ہے

کہ وہ وہاں اتر کر بھول ہی جاتا ہے کہ اسے یہاں سے اڑان بھی کرنی ہے۔

فاختہ کبوتر چیل یہ وہ پرندے ہیں جن کا منڈیروں سے رشتہ بڑھتے بڑھتے بالعموم یہ صورت اختیار کر لیتا ہے میں اتنا سوچ پایا تھا کہ اچانک میرے دھیان میں یہ بات آئی کہ پرندے منڈیر پہ اتر کر ممٹیوں اور برجیوں پر بیٹھنا زیادہ پسند کرتے ہیں پھر ان کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ جس منڈیر پہ وہ اتریں اس کی دیوار اونچی ہو۔ دانہ دنکے کے متلاشی پرندے جیسے گوریا چڑیاں یا کوے پست دیواروں اور سپاٹ منڈیروں کے ساتھ بھی گذارہ کر لیتے ہیں بلکہ شاید انہیں کو ترجیح دیتے ہیں کہ وہاں سے صحن میں پڑے ہوئے ٹکڑے نوالے تک رسائی آسان رہتی ہے مگر جو پرندے دانے دنکے سے بے نیاز آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرتے ہیں وہ نیچے اترتے ہوئے فلک بوس برجیوں اور ممٹیوں پر ڈیرا کرنا پسند کرتے ہیں کوئی چینی کبوتر آسمان پر تارا بن جانے کے بعد جب نیچے آنے لگتا ہے تو کوئی اونچی ممٹی کوئی فلک بوس برجی اسے اپنی طرف کھینچتی ہے اور وہاں اتر کر وہ اتنا مگن ہوتا ہے کہ یہ بھول ہی جاتا ہے کہ اسے اپنی چھتری پر واپس جانا ہے اور چیل تو اونچی ممٹی پر بیٹھ کر فوراً ہی مراقبہ میں چلی جاتی ہے مگر میں نے سوچا آشیانے کی نہ تو دیواریں اونچی ہیں نہ اس کی منڈیروں پر کوئی ممٹی اور برجی قسم کی کوئی چیز ہے بلند پرواز پرندوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ان کے پاس کیا ہے۔

پہلے مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ تعمیر کے دوران میں نے اس بات پر دھیان کیوں نہیں دیا تھا لیکن میں دھیان کیسے دیتا۔ میری تو سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے تعمیر کا بچھا ہوا نقشہ مجھے تو بس اینٹ گارے کا بلوہ نظر آتا تھا۔ اس بلوے میں سے کیا شکل ابھرے گی مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا ہاں زبیدہ کی نظر ساری جزئیات اور تفصیلات پہ تھی۔ مگر اسے ممٹیوں اور برجیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پھر مجھے ساجد پر غصہ آیا۔ مکان کا نقشہ میں نے ساجد ہی سے بنوایا تھا۔

وہ میرے ساتھ دفتر میں رہ چکا تھا مجھ سے جونیئر تھا رفتہ رفتہ خاصی دوستی اور بے تکلفی تھی پھر وہ امریکہ چلا گیا وہاں سے وہ بہت ماڈرن قسم کا آرکیٹکٹ بن کر آیا اور اپنے پیشے میں مصروف ہو گیا پھر میرا اور اس کا ٹاکرا ہی نہیں ہوا مکان کے نقشہ کا جب مسئلہ پیدا ہوا تو مجھے اس کا خیال آیا میں اس سے جا کر ملا۔ بہت خوش ہوا۔ مکان کے ذکر پر اس نے خود ہی پیش کش کی کہ اخلاق بھائی تمہارے مکان کا نقشہ میں بناؤں گا اور دیکھنا بارہ مرلہ کی جگہ کو اس طرح استعمال میں لاؤں گا کہ وہ ایک کنال میں پھیلی کوٹھی نظر آئے گی اس وقت اس نقشہ سے میں مطمئن تھا مگر اب مجھ پر اس کے نقص کھل رہے تھے میں ساجد کے پاس گیا اور کہا کہ "بھئی ساجد تم نے تو خالص مغربی سٹائل میں ہمارا مکان کھڑا کر دیا کچھ اس خاکسار کے دیسی مذاق کا بھی لحاظ رکھا ہوتا۔"

"اچھا۔ کیا کمی رہ گئی اس گھر میں؟"

"یار! وہاں ممٹی کوئی نہیں ہے"

"ممٹی؟ یہ کیا شے ہوتی ہے"

"کمال ہے ساجد، تم اپنے پرانے طرز تعمیر سے اتنے ناآشنا ہو۔ ممٹی کو نہیں جانتے۔ پرانے روایتی مکانوں کی دیواریں بہت اونچی ہوا کرتی تھیں، منڈیریں ان کی خاص وضع کی ہوتی تھیں اور گوشوں میں کوئی برجی کوئی ممٹی ہوتی تھی"

"اچھا اچھا برجی میں سمجھ گیا مگر اخلاق بھائی تم نے مجھ سے مکان کا نقشہ بنوایا تھا قلعہ کا نقشہ بنانے کو تو نہیں کہا تھا۔"

"نہیں یار قلعہ تو اور ہی شے ہوتی ہے اس میں تو بہت کچھ ہوتا ہے اب جیسے ہماری چراغ حویلی تھی جس میں.....

"یار اخلاق بھائی!" ساجد نے فوراً میری بات کاٹی "ایک تو میں اس بات سے بہت تنگ ہوں کہ ادھر سے جو بھی آیا ہے وہ ایک پودینے کا باغ اور ایک حویلی ضرور

چھوڑ کر آگیا ہے" زور سے ہنسا۔ میں بھی ہنس دیا۔ پھر کہنے لگا "خیر پودینے کے باغ تو میرا درد سر نہیں ہیں مگر ادھر دہ جانے والی حویلیوں نے مجھے بہت پریشان کیا ہے بھائیوں کے نام دس دس اور پانچ پانچ مرلے کے پلاٹ قرعہ میں نکلے ہیں مگر نقشہ بنوانے آتے ہیں تو حویلی کا تصور دماغ میں لے کر آتے ہیں۔ ایک بزرگ مجھے ہدایت دینے لگے کہ میرے عزیز انگنائی کشادہ ہونی چاہیے ہم نیم کا پیڑ لگائیں گے چاہتے ہیں کہ ساون میں بٹیا کے جھولے کا کچھ بندوبست رہے میں نے عرض کیا کہ قبلہ ہمارے پاس دس مرلہ جگہ ہے آپ نے اپنی جو ضروریات بتائیں ان کے پیش نظر کورڈ ایریا خاصا رکھا گیا ہے۔ انگنائی ونگنائی تو میں جانتا نہیں۔ چھوٹے سے لان کی گنجائش نکلتی ہے اس میں میری دانست میں تو کچھ پودے ہی لگائے جا سکتے ہیں آپ بے شک بگو کا پیڑ کھڑا کرلیں۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ آپ نئے ارکی ٹیکٹ مغربی طرز تعمیر کو اپنے اوپر اتنا سوار کر لیتے ہیں کہ اپنے یہاں کے طرز تعمیر کو خاطر ہی میں نہیں لاتے یا اس سے ناآشنا ہوتے ہیں نہ یہاں کی آب و ہوا کا لحاظ رکھتے ہیں نہ یہاں کے رہن سہن کا۔"

"اخلاق بھائی آپ کو شاید یہ احساس نہیں ہے کہ آپ کا رہن سہن کتنا بدل چکا ہے آپ کو شکایت ہے کہ آپ کے مکان کی دیواریں نیچی ہیں اونچی چھتوں دیواروں والے مکانوں کا زمانہ گذر گیا۔ اب ائرکنڈیشنر آگیا ہے۔"

"مگر میں ائرکنڈیشنر افورڈ نہیں کرسکتا۔ خس کی ٹٹی البتہ افورڈ کرسکتا ہوں۔"

"مگر اخلاق بھائی خس کی ٹٹی کو یہ ہمارا زمانہ افورڈ نہیں کرسکتا اور جہاں نمک مرچ تک میں ملاوٹ ہوتی ہے وہاں آپ کو اصلی خس کہاں مل جائے گی تو جہاں آپ نے مکان کی تعمیر میں اتنے لاکھ خرچ کر دیے ہیں وہاں چند ہزار خرچ کرکے ایک ائرکنڈیشنر لے لیجیے۔"

ساجد نے میری ایک نہیں چلنے دی اپنی کہے گیا آخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "ساجد" تم کچھ ہی کہو مگر تمہارا ایک جرم میں معاف نہیں کر سکتا"

"کیا؟"

"تم نے اتنی بڑی عمارت میرے لیے کھڑی کر دی مگر اس میں تم ایک ممٹی کی گنجائش پیدا نہ کر سکے۔

ساجد نے قہقہہ لگایا اور چلتے چلتے کہا کہ "اخلاق بھائی آپ کی ایک ممٹی کے لیے میں اپنی ماڈرن آرکیٹکٹ والی ریپوٹیشن کو خاک میں نہیں ملا سکتا تھا"

میں نے جب زبیدہ سے مکان کے اس نقص کا ذکر کیا تو اس نے بھی اس نقص کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ الٹا مجھے الزام دینے لگی "اخلاق جب مکان بن رہا تھا تو میں نے تمہاری کتنی منتیں کی تھیں کہ ان راج مزدوروں کا کوئی اعتبار نہیں میں ہر وقت ان کے سر پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ تم بھی تھوڑی بہت نگرانی کر لیا کرو۔ کوئی نقص نظر آئے تو فوراً ٹوک دیا کرو اس وقت تو تم نے میری سنی نہیں اب تم روز گھر میں ایک نقص نکال دیتے ہو"۔ پھر فوراً ہی ابو جان سے مخاطب ہوئی "بو جان آپ سن رہی ہیں اپنے بیٹے کی باتیں؟"

بو جان اپنے مراق میں بیٹھی تھیں ابھی تک انہوں نے ہماری باتوں پہ دھیان نہیں دیا تھا۔ مخاطب کیے جانے پر چونکیں "کیا ہوا؟"

"آپ کے بیٹے کو یہ مکان پسند نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ ناقص بنا ہے"

"اے بیٹے کیا نقص ہے اس میں؟"

اب مجھے اپنی بات کی وضاحت کرنی پڑی "بو جان آپ کو چراغ حویلی کی چھت یاد ہے چاروں طرف کتنی اچھی جالی بنی ہوئی تھی اور چاروں گوشوں میں کتنی خوبصورت

برجیاں بنی تھیں اور ممٹیاں ؟"

بوجان کو اشارہ مل گیا بس جاری ہوگئیں۔ "چراغ حویلی کی برجیاں تو ایسی خوبصورت تھیں کہ حویلی قلعہ نظر آتی تھی۔ تھی بھی تو اتنی اونچی سٹیشن سے اس کی برجیاں نظر آنے لگتی تھیں۔ اللہ رکھو نگر میں سب سے اونچی عمارت تھی اور پھاٹک کتنا اونچا تھا کہ ہاتھی مع ہودے کے اس میں سے گذر جائے قدم رکھتے ہوئے لگتا کہ قلعہ میں داخل ہو رہے ہیں۔"

چراغ حویلی کا بلند و بالا پھاٹک میرے تصور میں گھوم گیا محرابی پیشانی جس پہ دائیں بائیں دو بڑی بڑی مچھلیاں بنی ہوئیں تھیں خیر وہ تو حویلی تھی اور حویلی کے دروازے ہاتھی کے حساب ہی سے بنائے جاتے تھے چاہے ہاتھی ڈیوڑھی میں بندھا ہو یا بندھا ہو پھر آخر ہاتھی کی سواری کرنے والوں کے بھی تو کچھ قد ہوتے تھے مگر چھوٹے مکانوں کے دروازے بھی کتنے چوڑے اور اونچے ہوتے تھے۔ دو پٹوں والے پیتل کی موٹی موٹی کیلوں سے مرصع کنواڑ، دائیں بائیں اونچی چوکیاں ستونوں کے ساتھ، ان کے اندر بلے اور گہرے طاق، چوکھٹ اونچی، کشادہ ڈیوڑھی، ان دروازوں کے مقابلے میں مجھے آشیانے کا پستہ قد گیٹ کتنا بے وقار نظر آیا۔ کوٹھیوں کے گیٹ تو موٹر کے حساب سے بنائے جاتے ہیں مگر عجیب بات ہے، میں نے سوچا، سواری کے قد کے ساتھ آدمی کا قد بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

بہرحال میں نے سوچا کہ اب آشیانہ منہدم ہوکر دوبارہ تو تعمیر ہو نہیں سکتا۔ انہیں در و دیوار کے ساتھ گذر بسر کرنی ہے۔ برسات لگ چکی تھی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ ہار سنگھار کا ایک پودا لاکر لان کے ایک گوشہ میں لگا دیا، پرندوں کو تو کسی نہ کسی طرح آشیانے میں اتارنا ہی تھا مجھے گمان سا تھا کہ شاید پرندے مہکتے درخت پہ اترنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

برسات کا احوال مت پوچھو۔ ساون کے پہلے ہی ڈونگرے کے ساتھ آشیانے کی چھتوں نے ٹپ ٹپ شروع کر دی۔ زبیدہ کو اب پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ آشیانہ اتنا پختہ نہیں بنا ہے جتنا وہ سمجھ رہی تھی اب اسے اپنی چوک کا احساس ہوا کہ لنٹر پڑتے وقت اوپر جا کر اس نے نگرانی نہیں کی تھی۔ ٹھیکیدار اسے جل دے گیا۔ میٹیریل بچا لیا۔ ریت زیادہ کھپا دی۔ چھتوں کو تو ٹپکنا ہی تھا بس اس واقعہ کے ساتھ ہی برسات کے بارے میں میرے اور زبیدہ کے ردعمل میں فرق پیدا ہوتا چلا گیا جب گھٹا گھر کر آتی تو میری خواہش یہ ہوتی کہ اسے موسلا دھار برسنا چاہیے زبیدہ کی دعا ہوتی کہ خالی گرج کر گذر جائے۔ سو میں ڈونگرے کی آس لگا کر برآمدے میں آ بیٹھتا اور زبیدہ تسبیح لے کر پچھلے حصے میں کھڑے پپتہ قد کیکر کی طرف دوڑتی۔ یہ کیکر اس زمین میں پہلے سے کھڑا تھا زبیدہ نے تو چاہا تھا کہ اسے کاٹ دیا جائے کہ اس سے تعمیر میں کھنڈت نہ پڑے مگر میں نے اسے نہیں کٹنے دیا۔ زبیدہ کو اس برسات میں اس کی افادیت کا احساس ہوا۔ گھٹا جب گھر کر آتی تو وہ تسبیح لے جا کر اس کی شاخ سے باندھ دیتی۔

"یہ کیا چکر ہے!"

"یہ بی بی فاطمہ کے نام کی تسبیح ہے اسے صحن میں کھڑے درخت میں باندھ دیا جائے تو پھر بارش نہیں ہوتی۔"

"مگر زبیدہ یہ ساون کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہے اور نہ دھوپ اور لُو سے ستائی ہوئی خلقت کے ساتھ۔"

"ہاں تم یہ باتیں کرتے رہو۔ بارش ہونے کے ساتھ جب چھتیں ٹپکتی ہیں تو مصیبت تو مجھے جھیلنی پڑتی ہے۔"

چھتیں جیسی پڑی تھیں ان کا پتہ تو برسات کے واسطے سے چل گیا باقی عمارت کی کیفیت کا کس طور پتہ چلتا۔ مگر اب شک تو پوری عمارت کے بارے میں پیدا ہو

گیا تھا کمرے کی ایک دیوار میں دڑار دیکھ کر زبیدہ اس تشویش میں پڑ گئی کہ کہیں عمارت کی بنیاد تو نہیں بیٹھنے لگی ہے اب میں نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لیا کہ اسے عمارت کی طرف سے اطمینان دلاؤں" نہیں زبیدہ۔ بنیاد عمارت کی پختہ رکھی گئی ہے۔"

"کیا پتہ ہے۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا۔" زبیدہ نے افسردہ لہجہ میں کہا اور چپ ہو گئی پھر بولی" میں تو اس وقت سے ڈرتی ہوں جب عمارت سانس لے گی۔"

"اس کا کیا مطلب ہے۔"

"بات یہ ہے کہ عمارت بن چکنے کے بعد ایک مرتبہ سانس لیتی ہے کوئی کوئی عمارت تو سانس لینے کے ساتھ ہی بیٹھ جاتی ہے۔"

خیر یہ تشویش لمبی نہیں کھنچی۔ برسات کے ساتھ بات آئی گئی ہو گئی۔ زبیدہ جیسے بھول ہی گئی ہو کہ کبھی برسات بھی آئی تھی اور چھتیں ٹپکی بھی تھیں وہ آشیانے کے در و دیوار کے بیچ اب اتنی ہی مگن تھی جتنی برسات سے پہلے ہوا کرتی تھی میں کبھی کبھی بے اطمینان ہو جاتا تھا۔

"زبیدہ اس گھر میں کوئی طاق نہیں ہے۔"

"طاق؟" زبیدہ نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

"ہاں ایک دو طاق گھر میں ہونے چاہیے تھے اسی طرز کے محرابی شکل والے۔ دیکھو نا بجلی اب گھنٹوں کے حساب سے جاتی ہے اور تمہیں موم بتی ٹکانے کے لیے کوئی مناسب جگہ میسر نہیں آتی طاق ہوتے تو ان میں شمعدان رکھے ہوئے بھلے لگتے اور کمرے میں روشنی بھی اچھی ہوتی۔"

"ہاں۔ اور پھر طاق دھوئیں سے رچ جاتے۔ پھر کمرے کتنے خوبصورت لگتے۔" زبیدہ نے طنز بھرے لہجہ میں کہا۔ چپ ہو گی۔ پھر بولی" اخلاق، تمہیں وہیں رہنا چاہیے تھا، اپنی چراغ حویلی میں۔"

بوجان بیچ میں بول پڑیں "دلہن تم ٹھیک کہتی ہو میاں جان نے تو مرتے مرتے سمجھایا کہ جہاں ہو وہیں بیٹھے رہو خدا جو دکھائے سو دیکھو۔ میں نے بھی کہا کہ کاں کالے کو سول جا رہے ہو۔ مگر اخلاق کے باپ کو تو پاکستان سے عشق ہو گیا تھا۔ ادھر میاں جان کی آنکھ بند ہوئی ادھر چل کھڑے ہوئے مگر ان کی قسمت میں برتنا نہیں تھا یہاں آکر کتنے دن جیئے۔ ادھر آئے ادھر گئے۔"

"ان کے حق میں اچھا ہی ہوا۔"

"اے ہے یہ کیا بات ہوئی۔"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں بوجان۔ کتنے صدموں سے بچ گئے۔"

تو خیر آشیانے کے بارے میں میری بے اطمینانی بھی لمبی نہیں کھینچی۔ آشیانے ہی کی تقریب سے پریشانیوں کا ایک ریلا آیا اور اس بے اطمینانی کو بہا کر لے گیا۔ میں نے بتایا نا کہ دفتر سے ہاؤس بلڈنگ والوں سے مختلف بنکوں سے تو میں نے قرضے لیے ہی تھے، آخر میں کچھ دوستوں عزیزوں سے بھی چھوٹے چھوٹے قرضے ہی کوئی "دو دو ہزار ڈھائی ڈھائی ہزار روپے والے لے ڈالے تھے۔ میرا خیال تھا کہ کم از کم یہ لوگ میری مشکلات کو دیکھتے ہوئے تھوڑا توقف کریں گے مگر وہ ہاؤس بلڈنگ والوں اور بنکوں سے بڑھ کر بے صبرے نکلے ان سے پہلے ان کے تقاضے شروع ہو گئے اور سب نے ایک دم سے تقاضے کیے ادھر ایک بنک سے بھی یاد دہانی کا پروانہ آگیا کہ آپ نے ابھی تک قسطوں کی ادائیگی شروع نہیں کی ہے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"زبیدہ، یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے قرض خواہ تو مہلت دینے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔"

"ہاں یہ تو بڑی مصیبت ہے کمبختی مارے ہماری بوٹیاں نوچے ڈال رہے ہیں۔"

"اگر میں ان سب کے قرض اکٹھا چکا کر دوں تو گھر میں فاقے پڑ جائیں گے۔

اور پھر بھی سب کی ادائیگی نہیں ہوگی۔ آخر ایک تنخواہ میں کتنوں کو بھگتاؤں گا؟

"اخلاق تمہیں اب اور کوئی سبیل نکالنی چاہیے ایک سوکھی تنخواہ سے اب گاڑی نہیں کھینچے گی۔ اور تمہاری نوکری میں تو بالائی آمدنی بھی نہیں ہے۔"

"آخر کیا سبیل نکالی جائے۔ میری تو سمجھ میں کچھ آتا نہیں۔"

"سوچو، کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ دنیا کو دیکھو کس کس طریقہ سے لوگ کمائی کر رہے ہیں۔ تمہاری طرح خالی تنخواہ پہ تکیہ کر کے تو کوئی بھی نہیں بیٹھا ہوا۔"

قرض خواہوں کا دباؤ، ان سے بڑھ کر زبیدہ کا دباؤ، مجھے اضافی آمدنی کے لیے سنجیدگی سے سوچنا پڑا۔ صدیقی صاحب کا خیال آیا اور سمجھا کہ میری مشکلات کا حل نکل آیا۔ صدیقی صاحب ہمارے دفتر کے اکاؤنٹس سیکشن میں تھے معمولی تنخواہ تھی بائیسکل پر دفتر آتے جاتے تھے۔ ایک دن اچانک سکوٹر کو فراٹے سے چلاتے ہوئے آئے۔ رفقائے کار ان کے سکوٹر کو دیکھ کر حیران بھی ہوئے خوش بھی ہوئے۔ خوشی میں ان سے مٹھائی بھی کھائی۔ مگر دفتروں میں تاڑنے والے بھی ہوتے ہیں جو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں بس صدیقی صاحب ایک ایسے ہی رفیق کار کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے اور مشکل میں پھنس گئے۔ حساب کتاب میں گھپلا نکلا۔ بقول بعض لمبا غبن کیا تھا۔ بہرحال سفارشیں کرا کے کیس کو دبوایا۔ پھر استعفےٰ دیدیا۔ دفتر سے فراغت پاکر سارے جھنجھٹ سے چھوٹ گئے۔ ادھر سے فراغت پاکر اپنا کاروبار شروع کیا۔ ایک ڈائجسٹ نکالا جو چھ ماہ کے اندر اندر بیسٹ سیلر بن گیا اور سال کے ختم ہوتے ہوئے صدیقی صاحب نے سکوٹر کو ریٹائر کر دیا اور کار خرید لی۔ مجھ سے ان کے تعلقات شروع سے خوشگوار چلے آتے تھے۔ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ "اخلاق صاحب کچھ ہمارا ہاتھ بٹائیے۔"

"کیسے"

"کچھ ہمارے لیے لکھیے۔"

"صدیقی صاحب کیسی باتیں کرتے ہیں لکھنے والوں سے لکھوائے۔ میرا اس فن شریف سے کیا تعلق ہے۔"

"آپ نے اتنی کتابیں پڑھی ہیں لکھنا چاہیں تو آپ لکھ بھی سکتے ہیں۔"

"کتابیں پڑھنے کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ سے لکھنا بھی آتا ہو۔ میں کتاب پڑھتا ضرور ہوں، لکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔"

"اخلاق صاحب ایک مرتبہ آپ قلم اٹھائیے پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ میں لکھنے کی کتنی صلاحیت ہے یوں کیجیے کہ ہمارے لیے انگریزی سے کسی جاسوسی ناول کی تلخیص کر دیجیے ان ناولوں پر تو آپ کی نظر ہوگی۔"

"نہیں صدیقی صاحب، یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔"

"آپ ہمت تو کیجیے اور ایک بات میں عرض کر دوں آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی یہ گارنٹی دیتا ہوں کہ ایک سال کے اندر اندر آپ رکشاؤں کے جھمیلے سے نکل جائیں گے۔ چار پہیوں والی آپ کے قدموں تلے ہوگی۔

میں نے مشکل سے جان چھڑائی مگر تھوڑے عرصے کے بعد صدیقی صاحب پھر آکر مجھ سے ملے۔ اب کے ان کا رنگ اور تھا۔ کہنے لگے۔ "اخلاق صاحب، آپ کی دعاؤں سے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پیسہ تو ہم نے دال روٹی لائق کما لیا ہے اب سوچتے ہیں کہ پاکستان کی بھی کچھ خدمت کرنی چاہیے۔"

"اچھا خیال ہے" میں یہی کہہ سکتا تھا اور کیا کہتا۔

"اس کا خیال مجھے مڈل ایسٹ کا دورہ کرتے ہوئے آیا۔

آپ کو پتہ ہے کہ ہمارا ڈائجسٹ مڈل ایسٹ میں بہت نکلتا ہے میں نے پچھلے دنوں وہاں کا ایک سروے کیا۔ بہت بڑی مارکیٹ ہے صاحب۔ اور بہت امکانات

ہیں کوئی کام کرنے والا ہے۔ اس وقت تو وہاں انڈیا چھایا ہوا ہو اور صاحب کس کمال سے وہ اپنے کلچر کا پروجیکشن کرتے ہیں وہاں سے مجھے خیال آیا کہ ہم وہاں پاکستان کا پروجیکشن کیوں نہ کریں۔ آخر ہماری بھی ثقافت ہے، ادب ہے، آرٹ ہے تو اس سلسلہ میں آپ ہماری کیا مدد کریں گے۔ کچھ لکھنا پسند کریں گے کوئی کتاب بس ایسی کہ پاکستانی کلچر پر حرفِ آخر ہو۔ بہت ضرورت ہے ایسی کتاب کی۔"

"صدیقی صاحب آپ کو پتہ ہی ہے کہ لکھنے کے معاملہ میں میں صفر ہوں"

خیر یہ تو آپ کی کسرِ نفسی ہے اچھا اس پر بعد میں بات کریں گے۔ بہرحال اس معاملہ میں آپ ہمیں مشورہ تو دے سکتے ہیں۔"

"ہاں اس کے لیے حاضر ہوں۔ پتہ نہیں میرا مشورہ آپ کے کام آسکے گا یا نہیں۔"

"یہ آپ ہم پر چھوڑ دیجیے بس آپ ہمارے مشیر بن جایئے اور اس مقصد کو پیشِ رکھتے ہوئے کوئی منصوبہ بنا دیجیے اور میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا پوری خدمت کروں گا۔"

میں نے وعدہ کیا اور چلا آیا۔ مگر ہوا یہ کہ اسی دوران میں تعمیر کا بکھیڑا شروع ہو گیا اور مکان کی تعمیر تو ویسے ہی آدمی کی مت مار دیتی ہے سو وعدہ پورا کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ صدیقی صاحب کا ایک دو مرتبہ پیغام بھی آیا۔ مگر میں مکان کے جھمیلے میں ایسا پھنسا ہوا تھا کہ ان کے پاس جا ہی نہیں سکا۔

میں نے سوچا کہ صدیقی صاحب سے چل کر بات کرتے ہیں ادب اور فنونِ لطیفہ کے ذیل میں کیا کچھ پیش کرنا چاہیے اور کس طرح پیش کرنا چاہیے اس پر بہت سوچ بچار کر کے میں صدیقی صاحب کے پاس پہنچا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے بہت تپاک سے ملے جب میں نے انہیں ان کا منصوبہ یاد دلایا تو افسردہ ہو کر بولے کہ "اخلاق صاحب آپ کے پیچھے ہم اتنا دوڑے اور آپ ہاتھ نہیں آئے اب

تو وہ دیلا ہی لگ گیا۔"

"کیوں کیا ہوا۔ پاکستان کو اب اپنے پروجیکشن کی ضرورت نہیں رہی۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے اصل میں مارشل لا نے تو سارے بزنس ہی کو ٹھپ کر دیا۔ اور پری سنسر شپ نے تو ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں کوئی معقول کتاب چھاپی ہی نہیں جا سکتی۔"

دلیل دل کو لگنے والی تھی۔ میں قائل ہو گیا۔ خیر دیر تک ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے گذرے ہوئے اچھے زمانے کی باتیں کر کے اپنے آپ کو تسکین دیتے رہے باتیں کرتے کرتے صدیقی صاحب بولے "اخلاق صاحب ایک پروجیکٹ ہے اس میں آپ ہمیں کچھ مشورہ دیجیے۔"

"کیا؟"

"اسلامی بنکاری پر ایک کتاب لکھوانی ہے اس کے لیے کوئی آدمی تجویز کیجیے۔"

"صدیقی صاحب اس کے لیے تو کسی ماہر اقتصادیات سے رجوع کیجیے۔"

"معاف کیجیے میں نے انہیں ٹوہ کے دیکھ لیا ہے اسلام کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتے۔" تھوڑا رک کر "اخلاق صاحب آپ اس موضوع پر لکھیں تو کیا رہے۔"

"میں؟" اس تجویز پہ میں حیران رہ گیا "صدیقی صاحب اس موضوع پر تو میرا کوئی مطالعہ نہیں ہے۔"

"اخلاق صاحب ہمیں کوئی فاضلانہ مقالہ درکار نہیں ہے بس موٹی موٹی باتیں ہونی چاہییں۔"

میں نے بڑی مشکل سے اس پیش کش سے پیچھا چھڑایا۔

"اچھا خیر اس پروجیکٹ کو چھوڑتے ہیں ایک اور پروجیکٹ میرے ذہن میں ہے آپ فارسی تو ماشاء اللہ خوب جانتے ہیں مجھے یاد ہے آپ حافظ شیرازی کے

شعر بہت سنایا کرتے تھے ہم آپ کی فارسی دانی سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔"

"اچھا خیال ہے لائیے آپ کے لیے ہم حافظ کا ایک انتخاب کیے دیتے ہیں۔"

"حافظ کا انتخاب" صدیقی صاحب سوچ میں پڑ گئے "نہیں اخلاق صاحب۔ حافظ کا زمانہ گذر گیا اب اسے کون پڑھتا ہے۔"

"صدیقی صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ حافظ تو سدا بہار ہے۔"

"ارے اخلاق صاحب۔ حافظ کو تو اب ایران میں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ اسوقت تو ایسے شاعر کو پسند کیا جاتا ہے جس کے پاس دینے کے لیے پیغام ہو۔ گل و بلبل اور جام و سبو والی شاعری تو زوال کے زمانے کی یادگار ہے۔"

میں نے صدیقی صاحب کو حیرت سے دیکھا "صدیقی صاحب آپ بھی انقلابیوں والے روزمرہ میں باتیں کرنے لگے۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ انقلابیوں پہ تو میں لعنت بھیجتا ہوں انہوں نے تو ملک کا بیڑا غرق کیا ہے ساری نئی نسل کو لادین بنا دیا۔ صاحب میں تو اسلامی انقلاب کا قائل ہوں۔ ہاں لیجیے وہ بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔ ہمارے پاس ایران سے اسلامی انقلاب کے بارے میں بہت لٹریچر آیا رکھا ہے اسے سامنے رکھ کر اردو میں اسلامی انقلاب کے بارے میں ایک بہت اچھی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اخلاق صاحب آپ یہ کام کر سکتے ہیں اس میں اردو کی بھی خدمت ہے اور اسلام کی بھی۔"

"لو میں؟ ..... نہیں صدیقی صاحب میرے لیے یہ خدمت انجام دینا ذرا مشکل ہے۔"

"اچھا صدیقی صاحب مایوس ہو گئے" آپ کی خوشی۔ پھر کوئی آدمی ہمیں بتائے عالم فاضل آدمی کی ضرورت نہیں ہے بس فارسی کی شُدھ بُدھ رکھتا ہو۔ میٹیریل سارا ہم مہیا کریں گے اسے تو بس دائیں بائیں کرنا ہو گا۔"

"میں کتنی مشکلوں سے جان چھڑا کر وہاں سے واپس ہوا۔ گھر پہنچ کر دیر تک میں ڈھیر ہوا پڑا رہا۔ جیسے پتھر ڈھو کر آیا ہوں۔

"اخلاق کیا بات ہے بہت چپ چپ نظر آ رہے ہو؟"

"آج میں صدیقی صاحب کے پاس گیا تھا۔"

"ہاں ہاں وہ تو مجھے یاد ہی نہیں تھا۔ ان سے کوئی بات طے ہوئی؟"

"نہیں"

"نہیں؟ تم تو بڑے یقین سے کہہ رہے تھے کہ ان کے ساتھ معاملہ طے ہو جائے گا۔"

"پہلے جو انہوں نے بات کی تھی میں اس حساب سے سوچ رہا تھا۔"

"اب کیا ہو گیا۔"

"اب؟ ..... اب یہ ہوا کہ زمانہ بہت آگے نکل گیا، میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔"

زبیدہ بجھ سی گئی۔ خاموشی سے اٹھی اور کچن میں چلی گئی۔ دیر بعد کچن سے بھی اٹھ کر پچھواڑے والی دیوار کی طرف چلی گئی۔ وہاں پڑی ہوئی دو اینٹوں پر پنجے ٹکا کر ہیڑیاں اٹھا کر دیر تک پچھواڑے کے منظر کا جائزہ لیتی رہی۔ زبیدہ کا اب یہ طور بن گیا تھا کہ دن میں ایک دفعہ ضرور جب بھی اسے گھر کے کاموں سے فراغت ہوتی یا جب بھی گھر کے کاموں سے بور ہو جاتی اس طرف جاتی اور پچھواڑے کا مشاہدہ کرنے لگتی۔ گھر کی چار دیواری میں بند عورتوں کو باہر جھانکنے کا کتنا شوق ہوتا ہے باہر کھلنے والی کوئی کھڑکی یا ایسی دیوار جہاں سے باہر جھانکا جا سکے ان کا مرجع بن جاتی ہے۔ کس شوق کے ساتھ وہ وہاں سے باہر کا نظارہ کرتی ہیں یہ ان کی آؤٹنگ ہوتی ہے باہر دیکھنے کے لیے بیشک کچھ نہ ہو لیکن نظر کو منظر کی یکسانیت سے تو نجات ملتی ہے

چار دیواری کی تنگی سے نکل کر ایک کشادہ فضا میں نظر کو سفر کا موقعہ میسر آتا ہے نظر کے ساتھ ذات بھی ایک وسیع تر دنیا میں سانس لیتی محسوس ہوتی ہے اتنا تو تھا ہی مگر زبیدہ کے لیے اس مشغلہ میں شاید اس سے زیادہ معنی تھے مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس واقعہ کے بعد سے پچھواڑہ زبیدہ کے لیے زیادہ پُرمعنی زیادہ پراسرار بنتا چلا جا رہا ہے۔

بوجان نے برآمدے میں اپنی چوکی پہ بیٹھے بیٹھے کتنی مرتبہ بیچینی کے ساتھ زبیدہ کو دیکھا۔ آخر ضبط نہ ہوا۔ پکاریں "دلہن بس بھی کرو۔ آجاؤ"۔ زبیدہ ادھر سے واپس ہوئی اور بوجان کے پاس آ بیٹھی۔

"دلہن یہ جو تم وقت بے وقت ادھر جا کھڑی ہوتی ہو یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگتی۔ مت جھانکا کرو ادھر مجھے شک آوے ہے"۔

"بوجان اس روز کے بعد سے تو ادھر ایسا سناٹا ہوا ہے کہ نہ کوئی آدمی نظر آتا ہے نہ کوئی آواز سنائی دیتی ہیں"۔

"رات کو تو بہت آوازیں سنائی دیتی ہیں کمبخت چوکی والا آدھی رات سے جو آوازیں لگانی شروع کرتا ہے تو فجر تک لگاتا ہی رہتا ہے"۔

"مگر دن میں جانے سب کہاں دفن ہو جاتے ہیں۔ ہو کا عالم ہوتا ہے پھاٹک بھی بند پڑا رہتا ہے میں تو جانوں اس روز کے بعد سے کھلا ہی نہیں جیسے اب اندر کوئی ہے ہی نہیں"۔

بوجان نے لمبا ٹھنڈا سانس لیا "جانے کس ماں کے لال تھے۔ تینوں جوان تھے بچارے"۔

"بیچارے تو وہ نہیں تھے"۔

"دلہن ہمیں کیا پتہ کہ وہ کون تھے کیا کیا تھا انہوں نے"۔

"بوجان آخر کچھ تو انہوں نے کیا ہوگا کہ....." آگے کچھ کہتے کہتے زبیدہ جھجک گئی۔

"ہاں کچھ تو کیا ہوگا۔" بوجان چپ ہوئیں پھر سوچتے ہوئے بولیں "پتہ نہیں کمبختوں کے دماغ میں کیا کیڑا کلبلایا تھا یا آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے۔" بوجان چپ ہو گئیں۔

زبیدہ بھی جواب میں کچھ نہیں بولی۔ کتنی دیر بوجان کے گھٹنے سے لگی بیٹھی رہی مگر چپ۔

۶

تھکا ہارا میں دفتر سے آیا ہی تھا کہ زبیدہ نے ایک لمبا سا لفافہ ہاتھ میں پکڑا دیا۔

"کیا ہے یہ؟"

"پڑھ لو۔"

میں نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا کہ کہاں سے آیا۔ ہاؤسنگ فنانس کارپوریشن کی طرف سے تھا۔ "اچھا، اچھا۔ قسط کا تقاضا کیا ہوگا۔ ٹھیک ہے۔ اب ہمیں انہیں باقاعدگی سے ادائیگی شروع کرنی چاہیے۔"

"تقاضا نہیں نوٹس ہے۔" زبیدہ نے جلے کٹے لہجہ میں کہا۔ "کچھ لبنت کی خبر ہے۔ وہ ہمارا گھر نیلام کرنے لگے ہیں۔"

میں نے یہ سنتے ہوئے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ جلدی جلدی پڑھا۔ واقعی وہ تو نوٹس تھا اور نوٹس بھی ایسا ویسا نہیں۔ خبردار کیا گیا تھا کہ پچھلی ساری قسطیں معہ سود پندرہ دن کے اندر اندر ادا کر دی جائیں۔ بصورتِ دیگر محکمہ مکان کو نیلام کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ میں پریشان ہوا کہ پندرہ دن کے اندر اندر اتنی لمبی رقم کا انتظام کہاں سے کروں گا۔ کیسے کروں گا۔ مگر چہرے سے میں نے اپنی پریشانی ظاہر نہیں ہونے دی۔ کچھ ایسا تاثر دینے کی کوشش کی جیسے یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ قدرے بے اعتنائی سے کہا۔